مسلم دنیا

اور

مسلمان

فہرست مضامین

مسلم دنیا اور مسلمان　778

فراستِ مؤمنانہ　779

استعماری چالیں اور مسلمان　783

کیا ہم واقعی اتنے بے بس ہیں؟　786

معلم سے چند گزارشات　790

مسلم و غیر مسلم دنیا اور امریکہ　799

☆......☆......☆

فراستِ مؤمنانہ

گذشتہ دو ڈھائی صدیوں سے مسلمانانِ عالم کی ناگفتہ بہ حالات اور بالخصوص آج کے حالات کی آبادی اور وسائل کی فراوانی کے باوجود ہم ان اقوام کے مقابلے میں بھی کوئی قابلِ ذکر مقام نہیں رکھتے جن کو مؤرخین نے کبھی قوموں میں شمار ہی نہیں کیا تھا۔ مسلمانوں کے زوال اور انتشار کے بہت سارے اسباب گنائے جا سکتے ہیں لیکن میرے نزدیک اس کی سب سے بڑی وجہ ان تعلیمات و احکامات پر عمل نہ کرنا ہے جس سے مسلمانوں میں فراستِ مؤمنانہ پیدا ہوتی ہے، فراستِ مؤمنانہ کے ذریعے زندگی کے معاملات کی گتھیاں سلجھانا نسبتاً آسان ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اس حکمتِ نایاب کے ذریعے کم از کم مسلمان کسی فرد اور قوم سے دھوکا نہیں کھاتے۔

نبی ﷺ نے مسلمانوں کو دنیا کی اقوام کے ساتھ معاملات کرتے وقت یہ حکمت آموز قول گرامی عطا فرمایا ہے کہ "مؤمن ایک سوراخ سے دو دفعہ نہیں ڈسا جاتا"۔ ہم پاکستانیوں کو گذشتہ ساٹھ برسوں سے ایک طرح کے حالات بار بار پیش آتے ہیں اور ہم بار بار اسی طرح کی غلطیاں دہراتے رہتے ہیں۔ مثلاً ہمارے ہاں خواجہ ناظم الدین کو جس بے ترتیبی، لاقانونیت اور اقتدار کی لالچ میں غیر اہل لوگوں نے سازشیں کر کے حکومت سے ہٹایا۔ اس کی مذمت کرتے ہوئے بھی ہم بار بار اقتدار کے حصول کے لئے ناجائز طریقوں کے استعمال سے باز نہیں آتے۔ ایوب خان کا مارشل لاء اور اس سے نجات کے لئے جو تگ و دو اور قربانیاں دی گئیں۔ ہماری قوم میں تھوڑی فراست ہوتی تو پاکستان میں دوبارہ مارشل لاء کو کبھی نہیں آنا چاہئے تھا۔ امریکہ بہادر کے گلے شکوے ہمارے ہاں ہر دس بارہ سال بعد کورس کی صورت میں کئے جاتے ہیں۔ امریکہ سے معاملہ کرتے وقت ہم کیوں ایسی صورت حال سے دوچار ہو جاتے ہیں کہ بعد میں اس سلسلے میں ایک دوسرے کو مطعون کرنا باقاعدہ ایک فن اور حکمت عملی بن جاتی ہے۔ کیا ہمارے حکومتی سطح پر وزیروں کے فوج ظفر موج میں گنتی کے چند ایسے لوگ میسر نہیں آ سکتے جو قومی مفادات کا تحفظ کرنا جانتے ہوں یا قومی مفادات کے تحفظ کے لئے ڈٹ جانا جانتے ہوں۔

کیا ان معاملات کو حکمت کے ساتھ سدھارنے کے لئے بھی لقمان اور بقراط کو تلاش کرنا پڑے گا کہ پاکستان میں معدنی وسائل کی کمی نہیں لہٰذا اپنے پڑوسی اور عظیم دوست چین کے ذریعے ان کی دریافت کے لئے دن رات ایک کرنا چاہئے تاکہ خلق خدا کو روٹی، پانی، بجلی اور گیس تو میسر آ سکے۔ اگر یہ بھی ممکن نہیں تو کیا اسلامی

جمور یہ ایران جو ہمیں بجلی اور گیس دینے کے لئے خود بے تاب ہے، آخر ہمیں کون سی چیز اس میں تاخیر پہ تاخیر پر مائل کئے ہوئے ہے۔ علیٰ ہٰذا القیاس، ہمارے بہت سارے قومی اور بین الاقوامی معاملات ناخن فراست سے کھولے جانے کے انتظار میں منہ پھاڑے کھڑے ہیں، لیکن آج دہشت گردی کا معاملہ شاید اس نہج پر پہنچ چکا ہے جہاں اس بات کی سخت ضرورت محسوس ہونے لگی ہے کہ اب ہم سب کو مل کر فراستِ اجتماعی کے ذریعے اس کا ایک ایسا حل ڈھونڈنا پڑے گا جو نہ صرف دیرپا ہو بلکہ ملک وقوم کے لئے مفید بھی ہو۔

دہشت گردی کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لئے قومی سطح پر ہمیں ایک ایسی تھنک ٹینک تشکیل دینا ہوگی جس میں ہر شعبۂ زندگی کی نمائندگی موجود ہو۔ سارے شعبوں سے نمائندے چنتے وقت اس بات کا خاص خیال رکھنا ہوگا کہ ان افراد کے دلوں میں ملک وقوم کا غم ہو اور وہ اخلاص اور للّٰہیت کے ساتھ اس گھمبیر مسئلہ کو سلجھانے اور اس پر سوچنے سمجھنے کے شعور سے بہرہ ور ہو۔ گنتی، بھرتی یا جماعتی بنیادوں پر انتخاب سے بچنا لازمی ہوگا۔ اس قسم کے کئی تھنک ٹینکس بنائے جائیں تو اور بھی مفید ہوسکتا ہے کہ اگلے مرحلے پر ان سارے افراد کی اجتماعی حکمت وفراست سے اس گتھی کے سلجھانے میں احسن طریقے سے کام لیا جاسکتا ہے۔

میرا ذہن اس بات کو قبول کرنے کے لئے تیار ہی نہیں کہ سترہ کروڑ عوام میں دس ہزار ایسے آدمی میسر نہیں آسکتے کہ ان کو یہ کام سونپا جائے کہ وہ ہر وقت دہشت گردی کے معاملہ پر سوچتے رہیں تاکہ ان کے شعور اور تحت الشعور میں یہ معاملہ اس طرح رچ بس جائے کہ ان پر اس اہم معاملہ کے سلسلے میں القا ہونے لگے۔

انسان پر اللہ تعالیٰ کا یہ بہت بڑا کرم ہے کہ وہ جب کسی مسئلے کو اخلاص کے ساتھ حل کرنے کے بارے میں غور وفکر کرنے لگتا ہے تو غیب سے اس پر ایسے خیالات وافکار نازل ہونے لگتے ہیں جو عام حالات میں ذہن میں کبھی نہیں آتے۔

آج کی ساری سائنسی ایجادات کے موجدوں کی کہانیاں پڑھ لیں۔ انہوں نے کائنات میں جاری وساری اصولوں کو تب دریافت کیا جب کئی کئی سال تک وہ کائنات کی ان اشیاء پر لگاتار غور وفکر کرتے رہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے قرآن کریم میں انسان کو عطا کردہ اسی صلاحیت کو بروئے کار لانے اور اسے مہمیز لگانے کے بارے میں فرمایا ہے: ''ہم مسلمانوں کو بھی دیتے ہیں اور غیر مسلموں کو بھی، تیرے رب کی عطا سے، اور تیرے رب کی عطا بند نہیں ہے''۔ مراد یہ ہے کہ پروردگار کائنات کی عطا اسی کے لئے ہے جو محنتِ شاقہ اور جہد مسلسل کے

ذریعے اپنے آپ کو اس عطائے خصوصی کا مستحق ثابت کرے۔ سائنس دان اور تخلیق کار تو قابل ہی اس کے ہوتے ہیں کیونکہ وہ شاہکار کی تخلیق یا تسخیر کائنات کے لئے ایک گہری ریاضت اور طویل تپسیا کے عمل سے گزرنے کے لئے تیار ہوتا ہے۔ مختلف زبانوں کے دنیا بھر کے کلاسک شعراء بھی جب شاعری میں مستغرق ہو گئے تو ان کو بھی فکر و سخن میں یہی احساس ہونے لگا تھا کہ یہ نادر مضامین تخلیق کرنے میں غیب کا ہاتھ بھی کارفرما ہے۔ مرزا غالب نے اس کا بہت خوبصورت اظہار یوں کیا ہے: ؎

آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں
غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

علامہ اقبالؒ نے پروفیسر نکلسن کے سوال کے جواب میں کہا تھا کہ میں نے اپنی شاعری میں بہت کم دوبارہ کسی ردوبدل کی گنجائش محسوس کی ہے۔ انسان کا دماغ جب کسی معاملہ میں پوری طرح مدغم ہو جاتا ہے تو الہامی طور پر اسی کے ذہن میں اس معاملہ یا مسئلہ کے متعلق خیال کی گرہیں کھلنے لگتی ہیں۔

اسلامی تاریخ میں حضرت عمرؓ کے بارے میں مشہور ہے کہ اسلام قبول کرنے کے بعد آپؓ زیادہ تر حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ ہی میں وقت گزارتے تھے۔ وہ ہر وقت اسلام کے متعلق سوچتے رہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپؓ کے خلوص وللّٰہیت کے طفیل آپؓ پر اس نوع کا الہام نازل کیا کہ مسلمانوں پر سخت اوقات میں آپؓ کی فراستِ مؤمنانہ نے اللہ کے فضل و کرم سے کام آسان کر دیا۔ حضرت عمر فاروقؓ کی فراستِ مؤمنانہ کا یہ عالم تھا کہ رسولؐ اللہ ان کو مدینہ منورہ میں اپنے قریب رکھنا بہتر تصور فرماتے تھے تا کہ ان کی پُر خلوص اصابت کا اظہار ہوتا رہے۔

حضرت عمر فاروقؓ کا یہ قول مبارک "لا یخدع ولا یُخدع" (نہ دھوکہ دو نہ دھوکہ کھاؤ) اگر آج کے حالات میں زیرِ عمل لایا جائے تو پاکستان کی خارجہ اور داخلہ پالیسیوں میں اتنی خوشگوار تبدیلی آئیگی جس کے اثرات نہ صرف افراد اور معاشرہ پر مرتب ہوں گے بلکہ دہشت گردی کے خلاف کوئی مؤثر قومی لائحہ عمل بھی سامنے آسکے گا۔

قومی وسائل پر اخلاص، درد اور للّٰہیت کے ساتھ سوچنے سے حکمران طبقے میں اللہ تعالیٰ ان کو ایسی ادراک عطا فرماتا ہے جس سے ان میں بلا کی خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے۔ اور اس کے ذریعے ان میں اپنی اور قومی عزت نفس کا

کمال احساس بیدار ہوتا ہے۔ ان عوامل کے نتیجے میں حکمرانوں میں دور اندیشی اور معاملہ فہمی پیدا ہوتی ہے جسے فراستِ مؤمنانہ کہتے ہیں، فراستِ مؤمنانہ ہی مسائل کا تیر بہدف علاج ہوتا ہے۔

تعلقات دو آدمیوں کے درمیان ہوں یا دو ملکوں کے درمیان، اگر خلوص پر مبنی ہوں تو وہ مضبوطی سے قائم رہتے ہیں۔ دو آدمیوں کے مابین پر خلوص تعلقات کا تجربہ تو ہر انسان کو اپنی زندگی میں ہوتا ہے لیکن اقوام میں بھی اس کا تجربہ اور مظاہرہ سامنے آتا رہتا ہے۔ ہم گذشتہ تیس چالیس سال سے دیکھ رہے ہیں کہ چین اور پاکستان کی دوستی تمام حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے قائم ہے، کیونکہ اس میں خلوص ہے حالانکہ یہ دوستانہ تعلقات دو ایسے ملکوں کے درمیان قائم ہیں جو نظریات اور عقائد کے لحاظ سے ایک دوسرے سے 180 درجے کی سمت پر ہیں۔

حکمران کی حیثیت سے ایک شخص عوام کے دلوں میں صرف ایک طریقے سے جگہ بنا سکتا ہے اور وہ ہے اپنے منصب کی ذمہ داری کے بارے میں نیک نیتی سے کام کرنا۔ عزت اسی کو ہوگی جس کو لوگ ہر طرح سے بے داغ پائیں گے اور جو خود بھی وہی اچھے کام کرے جس کی دوسروں سے وہ توقع کرتا ہے۔

ان مشکل حالات میں ایک اہم بات حکمرانوں کی طرف سے یہ ہونی چاہئے کہ انسانی مساوات اور ذاتی محاسبہ کو اپنی شخصیت کے خلاف سمجھنا چھوڑ دیں۔ حکمران اور عوام کے درمیان مساوات لوگوں میں باہمی رشتہ مضبوط کرتی ہے اور صحیح محبت پیدا کرتی ہے۔ جس کے نتیجے میں پوری قوم میں فراستِ مؤمنانہ پیدا ہو کر مشکلات ومصائب کا ایسے انداز میں سامنا کرتی ہے کہ مسائل حل ہو کر قوم زندگی کے ہموار سفر پر اپنی منزل مقصود کی طرف رواں ہو جاتی ہے۔ فراستِ مؤمنانہ پیدا ہو جائے تو حضرت عمر فاروقؓ مدینہ منورہ سے عراق میں برسرپیکار فوج کے سپہ سالار کو بغیر کسی تار، لاسلکی، موبائل اور انٹرنیٹ و ایس ایم ایس کے ہدایات جاری کرتے ہیں اور اسلامی فوج کا سپہ سالار فراست کے حامل اپنے حکمران کی آواز سن کر اس پر عمل کرتا ہے اور مسلمانوں کو مشکلات سے نکال لیتے ہیں۔

اللہ ہمیں اور ہمارے حکمرانوں کو بھی فراستِ مؤمنانہ سے نوازے تاکہ قوم دہشت گردی کی اس نعمت سے صحیح سلامت نکل کر اپنی منزل کی جانب گامزن ہو۔

☆......☆......☆

استعماری چالیں اور مسلمان

دو ڈھائی صدیوں سے امت مسلمہ کے عام لوگ ہر طرف سے مصائب و مشکلات کے شکار ہو کر اللہ تعالیٰ کے حضور دہائی دے رہے ہیں لیکن آلام و آزمائشوں کی سیاہ طویل رات ہے کہ ختم ہونے میں آ ہی نہیں رہی۔ اُنیسویں صدی کے وسط سے ڈیڑھ ایک ملک کے علاوہ جب باقی سارے مسلمان کسی نہ کسی طرح استعمار کے ظالمانہ شکنجوں میں کراہ رہے تھے، تو اُس وقت مسلمان امت کے افراد کے درمیان بحیثیت قوم و امت کے ایک احساسِ یکجہتی و اُخوّت اِس لحاظ سے موجود تھا کہ اُن کے مصائب و آلام کا سبب ایک تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ خود استعماری عذاب میں مبتلا ہو کر بھی ایک دوسرے کے لئے دعائیں مانگنے کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے کے دامے، درمے، سخنے کام بھی آتے تھے۔

ہندوستان کے مسلمان اپنے شاندار ماضی کو ہار کر برطانوی استعمار کے تحت غلامی کی زندگی گزار رہے تھے لیکن مسلمانوں کے درمیان اُخوّت اتنی مضبوط تھی کہ جب ترکی خلافت کا تیاپانچہ کرنے کیلئے برطانوی صلیب کے تحت ترکوں کے خلاف عربوں کو استعمال کرتے ہوئے جنگ چھیڑی گئی تو اِس ہندوستان کے مسلمانوں نے تحریک خلافت برپا کر کے دُنیا بھر پر ثابت کر دیا کہ مسلمان ایک ہیں اور وہ ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہیں۔ شاید امیر مینائی مرحوم نے اسلام کے آفاقی پیغام اُخوّت پر مبنی یہ شہرہ آفاق شعر انہی ایام میں کیا ہوگا۔

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

اِسی جذبہٗ اُخوّت کے تحت نیلگوں فلک نے یہ نظارا بھی دیکھا تھا کہ ہندوستان کے مسلمان معاشی مجبوریوں کے ہاتھوں رائل برٹش آرمی میں بھرتی ہو کر ترکوں کے خلاف محاذ پر بھیجے گئے، لیکن ترکوں اور ہندوستانی مسلمانوں نے بہت کم ایک دوسرے پر گولیاں چلائیں، البتہ پہچان میں غلطی الگ بات ہے۔

خیبر کے پختون ترکوں کی خبریں پڑھنے کیلئے مولانا محمد علی جوہر کے "ہمدرد" اخبار کا پشاور میں انتظار کرتے تھے۔ کابل پر برطانوی استعمار اور افواج کی ستم کاریوں کے زمانے میں پورے ہندوستان کے مسلمان بے چین و بے قرار تھے۔ شاید شاعر نے اِسی کے پیش نظر لکھا تھا۔

اُخوت اِس کو کہتے ہیں کانٹا جو چُبھے کابل میں
تو دِلّی کا ہر اک پیر و جواں بے تاب ہو جائے

شاید اِسی نیک جذبے کے صدقے اللہ تعالیٰ نے اِسی دور میں امت مسلمہ میں بالعموم اور ہندوستان میں بالخصوص ایسے ایسے بلند قامت، اولوالعزم اور مخلص قیادت پیدا کی کہ آخرِ کار مسلمان غلامی کا طوق اتار پھینکنے میں کامیاب ہو گئے اور اِس کے نتیجے میں آج کی امت مسلمہ کے ستاون اسلامی ممالک وجود میں آ گئے۔

لیکن ہماری شامت دیکھئے کہ استعمار سے آزادی کے بعد جس طرح ہم ستاون حصّوں میں تقسیم ہو گئے اُسی طرح استعمار نے پھر کبھی ہمیں ملنے نہیں دیا۔ ہمارے ہاں بعض دانشور اِس بات کے مخالف ہونے کے ساتھ استہزا اُڑانے سے بھی نہیں کتراتے کہ ہم استعمار کو تو کوستے رہتے ہیں لیکن اپنے کرتوتوں پر کبھی غور نہیں کرتے۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمانوں میں بڑی خامیاں اور کوتاہیاں موجود ہیں ہم مسلمان ہو کر مختلف فرقوں میں بٹ گئے ہیں اور ایک دوسرے کے جان کے دُشمن بنے ہوئے ہیں، اِس میں یقیناً ہم مجرم ہیں کہ "اللہ تعالیٰ کی رسّی کو مضبوطی کے ساتھ تھامے رکھو" کے حامل ہونے کے باوجود ٹکڑیوں میں تقسیم ہیں لیکن کیا کوئی ذی شعور اِس سے انکار کر سکتا ہے کہ اِس میں ہمارے "مہربانوں" کی منصوبہ بندی اور نقود کا کردار بھی شامل ہوتا ہے۔

اِس کے علاوہ کیا کوئی اِس سے بھی انکار کر سکتا ہے کہ طاقت کی اپنی نفسیات ہوتی ہیں۔ طاقت اور وہ بھی بے لگام، کیا ہر کسی کو اپنے ڈھب اور مطلب و فائدہ کے مطابق نہیں لانا چاہتی۔ یہی وجہ ہے کہ آج امت مسلمہ بظاہر آزاد ہو کر بھی استعمار کے اشاروں پر چلنے پر مجبور ہے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ خرابی ہمیشہ ہمارے اندر واقع ہوتی ہے اور پھر سرطان کی طرح پورے نظام کو اپنے لپیٹ میں لے لیتی ہے۔

تیونس، مصر اور دیگر اسلامی ممالک کے احوال کو ملاحظہ کریں۔ کیا اسلامی ممالک کے اندرونی حالات اُس پھوڑے کے مانند نہیں ہیں جس پر نشتر چلانا ناگزیر ہوتا ہے۔ لیکن کیا نشتر امریکہ اور یورپی یونین چلائے گا؟ قطعاً نہیں، بلکہ یہ مسلمان ممالک کا اندرونی معاملہ ہے اور خود اِن ممالک کے عوام پر اِس کو چھوڑ دینا چاہیے۔ لیکن مصر کے حالات سے امریکہ، یورپی یونین اور اسرائیل وغیرہ اس لئے سخت پریشان ہیں کہ یہاں کہیں مصری عوام کی نمائندہ اور اُن کی آرزوں کی تکمیل کرنے والی لوگوں کی حکومت وجود میں نہ آئے۔ لہٰذا وہ خفیہ اور

علانیہ طور پر مصر کے معاملات میں مداخلت کر رہے ہیں۔ کیا وہ واقعی مصری عوام کی فلاح کے لئے ایسا کر رہے ہیں، اگر واقعی ایسا ہے تو اب تک مصری حکومت، اسرائیل کے بعد امریکہ سے سب سے زیادہ مالی امداد وصول کرنے والا ملک کیوں تھا۔ اِس لئے کہ اب تک حُسنی مبارکؔ اُن کے مفادات کیلئے مفید تھا، اب چونکہ اِسی وجہ سے حسنی مبارکؔ کے خلاف مصری عوام غیض وغضب کا اظہار کر رہے ہیں کہ موصوف حد سے زیادہ مغرب نواز اور امریکی مفادات کے تابع تھا۔ امریکہ کی تو عادت یہی ہے کہ کوئی جہاں اور جب تک اُن کے مفادات کے کام آسکتا ہے تب تک اُس کے ساتھ بڑے چاہ اور رچاؤ کے ساتھ تعلقات رکھنے اور نبھانے کا مظاہرہ کیا جاتا ہے لیکن جونہی اُن کے مفادات پورے ہو جاتے ہیں یا اُس شخص کے پاس مزید دینے کیلئے کچھ باقی نہیں رہتا تو اُسے مُنّی کی طرح بدنام کر کے دیدۂ عبرت نگاہ بننے کیلئے چھوڑ دیتے ہیں۔

کیا اب بھی کہ گذشتہ دو صدیوں کے دوران عالمِ اسلام کے جتنے حکمران بھی ذلیل وخوار ہو کر تخت وتاج سے محروم ہوئے ہیں اُن کے سروں پر اِسی "ہُما" کا سایہ نہیں رہا ہے۔ گذشتہ عشرے دو عشروں میں، کیا ایران ،عراق، کویت، فلپائن، لاطینی امریکہ کے بعض ممالک، اور اب مصر، تیونس کو انہی طاقتوں کی سرپرستی حاصل نہیں تھی۔ کیا اب بھی وہ سربراہانِ مملکت جو اپنے عوام کے ووٹ تو حاصل کر لیتے ہیں لیکن پالیسیاں بنانے اور چلانے میں اپنے عوام کی اُمنگوں کی بجائے اپنے آپ کو سپر پاورز کی طرف دیکھتے پر مجبور پاتے ہیں۔ اِسی کے نتیجے میں مسلمان عوام اُن کو استعمار کی کٹھ پتلی سمجھ کر اپنا سمجھنے کی بجائے غیروں میں شمار کر لیتے ہیں۔ پھر جب حکمرانوں اور عوام میں مغائرت کی دیوار کھڑی ہو جاتی ہے تو وہ دو متضاد قوتیں بن کر ایک دوسرے کے مقابلے میں صف آراء ہو کر اسلامی شعائر و اقدار کو داؤ پر لگانے کا سبب بن جاتے ہیں۔

کیا اب بھی وقت نہیں آیا کہ ہم اپنے انفرادی، قومی اور مِلّی کردار کو اسلامی سانچے میں ڈھال کر استعماری زمین رنگ پھندوں اور شکنجوں سے بچ کر "دانے" کی لالچ چھوڑ کر جناب خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلّم کی پاک سیرت سے روشنی حاصل کر کے دُنیا کو منوّر کرنے کیلئے نکلیں کہ اندھیرا بہت بڑھ گیا ہے۔

☆......☆......☆

کیا ہم واقعی اتنے بے بس ہیں؟

پاکستان کے قیام کے بنیادی محرکات میں اسلام اور مسلمانوں کی تعلیمات اور تہذیبی اقدار کا بنیادی کردار رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ساری قوتیں پاکستان کے خلاف ادھار کھائے بیٹھی رہی ہیں جو اسلام دشمن یا مخالف ہیں۔ ہندوستان کے وزیر اعظم نے حیلوں بہانوں سے پاکستان کے اثاثے روک کر نوزائیدہ مسلم مملکت کا معاشی طور پر گلہ گھونٹنا چاہا۔ لیکن اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے فرمان کے مطابق ''وہ بھی تدبیریں کرتے ہیں اللہ بھی تدبیریں کرتا ہے اور اللہ بہتر تدبیریں کرنے والا ہے'' کے مصداق ان کی ساری تدبیریں الٹی ہوگئیں لیکن پھر بھی وہ لوگ آرام سے نہیں بیٹھے بلکہ ایک قدم آگے بڑھ کر افغانستان کے بادشاہ ظاہر شاہ سے میران شاہ پر حملہ کرایا اور دوسری طرف جموں وکشمیر میں اپنی فوجیں اتار دیں۔ قائد اعظم کی ولولہ انگیز قیادت نے آج کے مقابلے میں اس وقت کی بہت کمزور پاک افواج کو دونوں محاذوں پر حملہ آوروں کو منہ توڑ جواب دینے کا حکم صادر فرمایا۔ یہ بھی ریکارڈ پر ہے کہ اس وقت پاک فوج کے برطانوی چیف نے ''الکفر ملۃ واحدۃ'' سب کفار ایک ملت ہیں، کا ثبوت دیتے ہوئے قائد اعظمؒ کے فرمان کو ماننے سے انکار کیا تھا، لیکن پھر بھی ہماری افواج اور بہادر و غیور قبائل سری نگر تک پہنچ کے رہے۔

۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی جنگوں میں ایک دنیا نے ہماری بہادر افواج کا لوہا مانا تھا۔ اس زمانے میں برطانیہ کے دفاعی ماہرین نے پاکستانی افواج کے بارے میں کہا تھا کہ ایسی فوج کو شکست دینا بہت مشکل کام ہے جو جنگی مورچوں میں اللہ و رسول ﷺ کے نام پر گڑ کی ٹکی بُھنے ہوئے چنے کے دانوں پر اکتفا کرتے ہوئے ہفتوں مہینوں لڑنے کے لئے تیار رہتی ہے جبکہ دنیا کی دیگر افواج کے افسر مورچے میں بھی شراب کی بوتل اور اس کے لوازمات مانگتے ہیں۔

ایک زمانے تک لندن سے دنیا کے دفاعی امور کے بارے میں چھپنے والے رسالے پر پاکستانی ایئر فورس کی تصاویر سرورق پر چھپتی تھیں۔ مصری افواج کے چیف جنرل ابو غزالہ کا یہ بیان بھی ریکارڈ پر ہے کہ اسلامی دنیا کی افواج میں سے صرف پاک فوج ہی اسرائیلی فوج کا مقابلہ کر سکتی ہے۔ اسرائیلی لیڈروں کو قیامِ پاکستان کے مقاصد اور اس کے عوام کی سرشت میں حُبّ نبوی ﷺ کے بارے میں بخوبی معلوم تھا۔ یہی وجہ ہے کہ

اسرائیل کے پہلے وزیر اعظم ڈیوڈ بن گوریان کا یہ بیان ''جیوش کرانیکل'' نامی مجلّے کے ریکارڈ پر ہے جس میں پاکستان کو اسی بناء پر اسرائیل کا دشمن نمبر ایک قرار دیا گیا ہے اور یہ عہد کیا گیا ہے کہ پاکستان کو نقصان پہنچانے کا کوئی موقع ضائع نہیں کیا جائے گا اور یہ منصوبہ بھی بنایا گیا تھا کہ پاکستان کو زچ کرنے کا بہترین ذریعہ ہندوستان ہے۔ لہٰذا یہ بات بھی واضح ہو چکی ہے کہ ہندو بنیا نے اپنی روایتی مکّاری کے تحت ایک عرصے تک مالدار عرب ممالک سے فوائد کے حصول کی خاطر اسرائیل کے ساتھ درپردہ باہم تعاون کے تعلقات قائم کئے رکھے مگر سفارتی تعلقات استوار نہیں کئے۔ اب تو وہ پردہ بھی اٹھ چکا ہے۔ ہندوستان کے ساتھ اسرائیل کے گہرے تعلقات ہیں اور اسرائیل نے ہندوستان کو ۱۹۷۱ء کی جنگ میں بھرپور سپورٹ فراہم کیا۔ اسکے علاوہ کہوٹہ پلانٹ پر حملہ آور ہونے کے لئے اسرائیل نے جموں و کشمیر ہی کے ہوائی اڈوں تک اپنے جہاز پہنچائے تھے لیکن محسنِ پاکستان ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی پاک افواج کو فراہم کردہ طاقت کے بارے میں جان کر بزدل ہنود اور یہود اپنے مذموم و ناپاک منصوبے سے باز آئے تھے۔

ان واقعات کے تذکرے کا مدعا یہ ہے کہ اتنی سازشوں، ہزیمتوں اور نقصانات کے باوجود پاکستان کو کبھی کسی نے اتنا ہلکا نہیں لیا تھا۔ ہندوستان میں ہماری افواج قید ہو کر بھی اپنی تاریخ، اپنی شان اور اپنا ماٹو، ''ایمان، تقویٰ، جہاد فی سبیل اللہ'' نہیں بھول پائی تھی۔ ذوالفقار علی بھٹو مرحوم نے ان مشکل ترین حالات میں بھی حوصلہ نہیں ہارا اور گھاس کھا کر پاکستان کو موقع پرستوں کی میلی نگاہوں سے ہمیشہ کے لئے محفوظ بنانے کے لئے ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی خدمات حاصل کیں۔ امریکہ کے مشہور وزیر خارجہ ہنری کسنجر نے دھمکی دی تھی کہ ہم آپ کو دیدۂ عبرت نگاہ بنادیں گے۔ بھٹو شہید نے جان دے دی لیکن پاکستان کو ایٹمی قوت بننے کی راہ پر ڈال کے رہا۔

پاکستان دنیا کا ساتواں ایٹمی ملک بننے کے لئے جو قربانیاں دیتا رہا ہے وہ کسی بھی صاحبِ نظر سے پوشیدہ نہیں، لیکن سچ کہئے کہ کیا یہ ساری قربانیاں قوم نے اس لئے دی تھیں کہ ایک طرف ہندو بنیا دوستی کی آڑ میں جموں و کشمیر سے پاکستان کی طرف آنے والے دریاؤں پر سندھ طاس معاہدہ کی کھلی خلاف ورزی کرتے ہوئے غیر قانونی ڈیم بنا کر پاکستان کو صومالیہ اور ایتھوپیا بنانے کے مکرہ عزائم رکھے اور دوسری طرف ہمارے نوجوانوں کو ثقافتی طائفوں کے ذریعے رام کرنے کے منصوبے بنائے۔ کرکٹ کے ذریعے پاکستانی کھلاڑیوں کو اچھے دام کی پیشکش کے ذریعے بغاوت پر اکسا کر اپنے ہاں مہینوں رکھ کر وہاں اپنی اداکاراؤں اور دیگر شوبز

کے افراد سے ان کا دل لبانے اور للچانے کا انتظام کیا۔ یاد رکھنا چاہئے کہ وہ قوم جس کے بارے میں مشہور ہے کہ ''چمڑی جائے، دمڑی نہ جائے'' وہ اگر پاکستانیوں کو کرکٹ کے لئے لاکھوں روپے دیتے ہیں تو ''بنیا کا بچہ کچھ دیکھ کر ہی گرتا ہے'' کے مصداق ضرور کچھ خاص مقاصد کے تحت ایسا کر رہا ہوگا۔

مقبوضہ کشمیر جہاں اس وقت کوئی ایسا گھرانا نہیں جس کا کوئی رکنِ خاندان شہید نہ ہوا ہو، پاکستان کے سلمان احمد نامی ماسٹر بینڈ موسیقی اور بے ہودہ رقص کے ذریعے ''جہاد'' کر رہے ہیں۔ جی ہاں! اس نے مقبوضہ کشمیر میں موسیقی اور رقص کے ذریعے امن اور شانتی کے فروغ کے لئے اپنے پاپ بینڈ کو ''جہاد برائے امن'' قرار دیا ہے۔

یہ ساری رام کتھا سنانے کا مقصد یہ ہے کہ سولہ کروڑ بہادر اور غیور عوام، اوپر سے ایک منظّم اور ڈسپلن کی حامل باقاعدہ اور مانی ہوئی پاک فوج، ایٹمی اسلحہ اور جے ایف تھنڈر-۱۷ سے لیس، کیا واقعی اتنی کمزور ہوگئی ہے کہ شمالی وجنوبی علاقہ جات میں تو چونکہ ''دہشت گرد'' رہتے ہیں لہٰذا اگر بمباریاں ہوتی رہیں اور بے گناہ ومعصوم بچے، خواتین اور بزرگ شہری رزق خاک ہوتے رہے تو کوئی بات نہیں، لیکن اب معاملہ اس حد تک پہنچ گیا ہے کہ اس پاک فوج کے افسر اور جوان بھی محفوظ نہیں جس نے سوپر پاور کے اتحادی اور نیٹو افواج کے نان نیٹو اتحادی کے طور پر گزشتہ چار پانچ سال کے دوران گیارہ سو سے زیادہ جوان اور افسر دہشت گردی کے خلاف جنگ میں قربان کئے۔ اب ''فرینڈلی فائر'' سے گزر کر بات خدشات تک پہنچی ہے۔ امریکی افواج کے افراد چونکہ قیمتی ہیں لہٰذا انہیں جہاں کہیں کوئی خدشہ بھی نظر آتا ہے تو اسے اس بات کی پرواہ نہیں کہ ہمارے اس بے بنیاد خدشے کے نتیجے میں دوسرے آزاد ملکوں کے آزاد اور بے گناہ شہری جان سے ہاتھ دھو سکتے ہیں۔

کاش! انسانیت اور انسانی حقوق کے غم میں مرے جانے والے لوگ اور NGO's اس قسم کے حملوں کے نتیجے میں یتیم ہونے والے بچوں کا مستقبل، بیوہ ہونے والی خواتین کی زندگی بھر کا روگ، ضعیف والدین کے دلوں سے اٹھنے والی ہوک اور فریاد دیکھ اور محسوس کر سکتے۔

ہم امریکہ کے اتحادی اور امریکہ کی سپر طاقت کے مقابلے میں بہت کمزور ہونے کی بناء پر کوئی جوابی قسم کی چیز کا اگر سوچ بھی نہیں سکتے تو کم از کم امریکہ کو یہ احساس دلانے کے لئے بہت سارے طریقے موجود ہیں کہ جناب والا! بس، اب بہت ہو چکا، اپنا پاندان اٹھایئے۔ ہم ایسی محبت سے باز آئے جس میں عزتِ سادات

بھی چلی جاتی ہے۔ اگر چہ ہم امریکہ کے مقابلے میں بہت کمزور ہونگے لیکن اتنے کمزور بھی نہیں جتنا ہم نے خود اپنے آپ کو کمزور سمجھا یا بنایا ہے۔ آخر ہم کیوبا، وینزویلا اور اسلامی جمہوریہ ایران سے بھی کمزور ہیں کہ وہ تو اپنے مفادات اور قومی حمیت اور غیرت کے لئے اپنا سب کچھ داؤ پر لگانے کے لئے تیار رہ کر اپنے آپ کو محفوظ کر سکیں اور ایک ہم ہیں کہ اب خیر سے کابل کا مسخرا چغہ پوش بھی وضو کئے بغیر ہمارا نام لینے لگا ہے۔

ڈکٹیٹر ایوب خان کے دور میں چیف جسٹس افتخار چوہدری کی طرح شہرت حاصل کرنے والے جج رستم کیانی مرحوم نے طاقتور کو یہ باور کرانے کے لئے کہ کمزور اتنا بھی کمزور نہیں ہوتا جتنا اپنی طاقت کی نمرودیت، شدادیت اور فرعونیت میں ڈوبا طاقتور سمجھتا ہے، کیا خوب فرمایا تھا کہ ''گو میں اتنا طاقتور تو نہیں کہ ایوبی اقتدار کے بے ہنگم ٹرک کو روک سکوں لیکن اس کے سامنے لیٹ کر اپنی کمزور، نحیف اور نوکیلی پسلیوں کے ذریعے اسے پنچر کر کے کچھ دیر کے لیٹ ضرور کر سکتا ہوں''۔ اگر ہم یہ بھی نہیں کر سکتے تو کم از کم احتجاج کے وہ سارے ذرائع تو استعمال کر سکتے ہیں جو ایسے مواقع پر مہذب دنیا کے ہاں رائج ہیں۔ اور یہ کہ ایسے موقع پر متعلقہ محکموں کے وزراء مستعفی ہو جاتے ہیں۔ اگر ہم اس نازک موقع پر اپنا بھرپور کردار ادا نہ کر سکیں تو ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ ؎

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات

☆......☆......☆

معلّم سے چند گزارشات

دنیا میں سب سے مشکل کام پڑھنا اور پڑھانا ہے۔ یہ کام نہ صرف صبر آزما بلکہ خون جگر طلب کرنے والا کام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا میں معلّمی اور متعلمی کا مقدس پیشہ ہر زمانے میں پہلے پہل اولوالعزم انبیاء کو سپرد کیا گیا۔ انبیاء پہلے مرحلے میں بہترین متعلم ہوتے ہیں۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ جو کچھ جن مقاصد کے لئے ان کو پڑھا دیتے ہیں وہ ان کے یاد کرنے میں اس پر عمل کرنے میں اور اس کو کما حقہ دوسروں تک پہنچانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم تک سارے انبیاء کرام نے پڑھنے اور پڑھانے کا فرضہ بہت خوش اسلوبی سے سرانجام دیا ہے۔ اس مختصر مضمون میں تعلیم وتعلم کے مشن سے وابستہ حضرات کی خدمت میں سرکار دوعالم فخر المعلمین کی سیرت کی روشنی میں وہ نکات زیر بحث لانے کی کوشش کی جائیگی جن کے ذریعے ایک مثالی معلم بننے کے لئے رہنما اصول سامنے آسکتے ہیں۔ انہی رہنما اصولوں کی روشنی میں معلمین حضرات آج کے دور میں بھی طلباء کا اعتماد حاصل کرسکتے ہیں۔

آج کے دور میں معاشرے کے دیگر شعبوں میں متعدد شکایات کی طرح تعلیم وتعلم کا شعبہ بھی بہت زبوں حالی کا شکار ہے۔ معاشرہ استاد سے شاکی ہے کہ استاد سب کچھ کرتا ہے لیکن پڑھاتا نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان میں گورنمنٹ سکولز کا حال بہت ہی پتلا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ گورنمنٹ سکولوں کو اس حال تک پہنچانے میں بہت سارے عوامل نے اپنا کردار ادا کیا ہے۔ لیکن بنیادی کردار استاد کا ہے۔ استاد بھی اپنے معاشرے کے افراد اور طلباء سے زیادہ خوش نہیں۔ اساتذہ حضرات کی بھی بعض معقول شکایتیں قابل غور ہوسکتی ہیں۔ لیکن میں پھر بھی کہوں گا کہ استاد کو معاشرے سے شکایت کا زیادہ حق نہیں کیونکہ معاشرہ استاد ہی کا تشکیل کردہ ہوتا ہے۔ اس کی مثال یوں دی جاسکتی ہے کہ جیسے ایک مصور کوئی تصویر بناتا ہے اور پھر نمائش کے لئے پیش کرتا ہے لوگ تصویر کو ناقدانہ نظر سے دیکھتے ہوئے قسم قسم کی خامیوں اور کوتاہیوں نشاندہی کرتے ہیں لیکن سچا مصور ان خامیوں کو نوٹ کرکے اگلے ایڈیشن میں ان کو دور کرنے کی کوشش کرتا ہے نہ کہ وہ خود بھی ناقدین کے ساتھ مل کر اپنی ہی تصویر پر انگلی اٹھانا شروع کرتا ہے۔ معلّمی کی یہی شان ہے کہ جس کی بناء پر اسے معمار قوم وملت کہا جاتا ہے۔ استاد جب اس خلوص، جان نثاری اور للّٰہیت کے ساتھ اپنا فرض ادا کرنا شروع کرتا ہے تو

معاشرہ اسے سر آنکھوں پر بٹھا کر پیغمبری پیشہ ور کہنا شروع کر دیتا ہے۔اور پھر استاد محسوس کرتا ہے کہ وہ واقعی پیغمبرانہ مشن سرانجام دے رہا ہے۔

اس پیغمبرانہ مشن کا درس ہمیں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت مبارکہ سے حاصل ہوتا ہے۔ جنہوں نے برحق فرمایا تھا: "إنّما بعثت معلّماً"(۱) ''بے شک مجھے معلم بنا کر بھیجا گیا ہے''

نبی کریم ﷺ کی سیرت مبارکہ سے بطور معلم ہدایت ورہنمائی حاصل کرنے سے پہلے ضروری سمجھتا ہوں کہ چند ایک اشارے آج کے طلبہ کے سامنے پیش کروں کہ نبی ﷺ پر جب اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے علوم کے خزانے کھول دیئے گئے تو پہلی ہدایت جو دی گئی ہے وہ ان مبارک الفاظ پر مشتمل ہے:

"اقرا باسم ربّك الّذي خلق"(۲)

''پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا''

اسلام میں پڑھنے پڑھانے کا لازمی نتیجہ تخلیق (Creativity) ہونا چاہئے۔اسلئے کہ وحی خداوندی کی پہلی تعلیم ہی یہی ہے۔دوسرا نکتہ اس آیت میں یہ ہے کہ انسان کو حکم دیا گیا ہے کہ جو کچھ بھی آپ پڑھیں سیکھیں تو اللہ کا نام لے کر پڑھیں سیکھیں۔اس میں یہ زریں اصول پوشیدہ ہے کہ اسلام ان علوم کے سیکھنے کی ہدایت کرتا ہے جو انسانیت کے لئے مفید و نفع بخش ہوں نہ کہ ضرر رساں علوم جس سے انسانیت کو تباہی و بربادی کا سامنا کرنا پڑے۔شاید اسی اصول کے پیش نظر مسلمانانِ عالم نے اپنے زمانۂ عروج میں بہت ساری ایجادات وانکشافات کیں لیکن بارود (Explosive) کی ایجاد کے فارمولے کو جانتے ہوئے بھی اس کو منظر عام پر نہیں لایا گیا کہ اس سے انسانیت کو خطرات لاحق ہو سکتے تھے۔

تیسرا اہم نکتہ اس آیت مبارکہ میں یہ ہے کہ اسلام سے پہلے مختلف مذاہب میں حصول علم پر عام لوگوں کے لئے جو پابندیاں عائد کی گئی تھیں وہ ہٹا دی گئیں اور علم کو عام کر دیا گیا اور اس کے حصول کو لازم کر دیا گیا۔ ''تعلیم سب کے لئے'' اسلام کا پہلا اور بنیادی نعرہ (slogan) ہے۔ ہمارے پڑوسی ملک بھارت میں آج بھی شودر مقدس وید کی تعلیمات سننے کا حق نہیں رکھتا۔امریکہ میں بھی بعض خاص علوم کے دروازے تیسری دنیا بالخصوص مسلمانوں پر بند ہیں، مثلاً سیول نیوکلیئر ٹیکنالوجی۔

ان نکات کو مدنظر رکھ کر استاد پر بہت بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآء ہونے کے لئے بھی قرآن کریم کی ہدایات سے رہنمائی حاصل کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ دنیا کے سب سے بڑے معلم انسانیت جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب معلّمی کا فریضہ سونپا گیا تو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو یاددلاتے ہوئے فرمایا:

"لقد منّ الله على المؤمنين إذ بعث فيهم رسولاً مّن أنفسهم يتلوا عليهم اٰياته ويزّكيهم ويعلّمهم الكتٰب والحكمة"(۳)

''خدا نے مؤمنوں پر بڑا احسان کیا ہے کہ ان میں انہی میں سے ایک پیغمبر بھیجے جو ان کو خدا کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے اور ان کو پاک کرتے اور (خدا کی) کتاب اور دانائی سکھاتے ہیں''

کسی فرد یا قوم کو اچھے استاد کا میسر آنا یقیناً اللہ کا بہت بڑا احسان ہوتا ہے۔ اچھے استاد کی پہچان اس آیت مبارکہ میں یہ بتائی گئی ہے کہ وہ قوم کے افراد کو پڑھنا لکھنا سکھاتا ہے۔ پڑھنا لکھنا خود اس لئے نہیں ہوتا کہ شرح خواندگی میں اضافہ ہو جائے اور حکومت دعوی کر سکے کہ دیکھو جی! ہماری شرح خواندگی ۹۹ فیصد ہوگئی ہے۔ لہٰذا اب ہم ترقی یافتہ اقوام میں شامل ہو گئے ہیں۔ صرف شرح خواندگی اصل ترقی کا راز ہوتی تو سری لنکا میں نسلی فسادات نہ ہوتے جہاں واقعی شرح خواندگی ۹۰ فیصد ہے۔ بلکہ پڑھنے لکھنے کا اگلا درجہ (Step) تزکیہ ہونا چاہئے۔ اگر پڑھنے کے نتیجے میں فرد اور قوم کو تزکیہ نفس حاصل نہیں ہوتا تو ضرور کہیں استاد، شاگرد اور نصاب تعلیم میں خرابی اور بگاڑ ہے۔

علم کے ذریعے تزکیہ نفس کا حصول کس طرح ہوتا ہے اور اس سے کیا مراد ہے؟ گو کہ یہ بہت تفصیل طلب بات ہے لیکن آج کے مادہ پرست دور میں جہاں مغربی افکار کی روشنی میں ''دولت خدا ہے'' (Money is God۔ یا ''لاالٰہ الا المال'' مال کے سوا کوئی معبود نہیں''، کا نظریہ حیات پوری قوت کے ساتھ گلوبلائزیشن کے زیر سایہ پروان چڑھ رہا ہے۔ مختصر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے اس قول کی روشنی میں کہ ''دنیا کو اس طرح کماؤ جیسے یہاں ہمیشہ رہنا ہے لیکن دنیا میں رہو اس طرح جیسے کل مر کے جانا ہے۔ آسانی کے ساتھ سمجھا جا سکتا ہے۔

آج کے دور میں تعلیم وتعلم کا لازمی اور پہلا مقصد روپیہ پیسہ کمانا ٹھہر گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پوری دنیا میں مغربی فکر کے زور پر ایسے علوم کے حصول پر زور دیا جاتا ہے جس کی طلب عالمی منڈی میں ہو۔ اس قسم کے علوم کو ''مرتکز بالسوق علوم'' (Market Oriented) کہا جاتا ہے۔ دراصل اس نعرے کے ذریعے وہ ایک تیر سے دو شکار کھلنا چاہتے ہیں۔ ایک یہ کہ ان کے کارخانوں، صنعتوں اور تعیش وتنعم کے مال کی پیداوار کیلئے سستی افرادی قوت بآسانی میسر ہو۔ دوسرا یہ کہ اسلامی ممالک میں دینیات، اخلاقیات، تعمیری ادب اور سوشل سائنسز (Social Sciences) کے دیگر مضامین کو دیس نکالا ملے تاکہ کوئی ان کے رنگ میں بھنگ ڈالنے والا نہ ہو۔

جب اساتذہ قوم کے افراد میں تعلیم وتعلم کے ذریعے تزکیہ پیدا کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں تو پھر اس کا لازمی نتیجہ حکمت ودانش (Wisdom) ہوتا ہے، اس طرح ایک حکیم قوم وجود میں آجاتی ہے۔ تب وہ زندگی کے تمام معاملات کو حکیمانہ طرز عمل سے چلانے لگتے ہیں۔ معلم انسانیتؐ نے اسی نظام تعلیم کے ذریعے تاریخ انسانیت میں سب سے زیادہ حکیم ومدبر قوم کو وجود دیا تھا۔ جو سب کے لئے قیامت تک بہترین مثال کے طور پر موجود رہے گی۔

استاد کے لئے تعلیم وتعلم کے ذریعے زندگی کے اس اہم ہدف کو حاصل کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں گو کہ بقول غالب۔

؎ بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا

لیکن پڑھانے لکھانے کا کام جان جوکھوں کا کام ہے۔ دنیا کے مختلف امور اور کام چند سالوں کی محنت شاقہ سے شاید سیکھے جاسکتے ہیں۔ لیکن جہاں تک پڑھنے لکھنے کے ذریعے تزکیہ اور حکمت ودانش کے حصول کا تعلق ہے تو یہ کام تائید وفضل ایزدی کے بغیر ممکن نہیں۔

شاید اسی لئے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جیسے اولوالعزم اور عظیم الشان پیغمبر کو پیشہ معلّمی شروع کرتے وقت مخصوص ہدایات دی گئیں کیونکہ عرب کے جاہل شاگردوں کو پڑھانا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ یاد دلاتے ہوئے فرمایا کہ موسیٰ جب فرعون جیسے جبار کے دربار میں کلمۂ حق پڑھانے اور سکھانے جارہے تھے تو انہوں نے یہ دعا مانگی کہ:

ربّ اشرح لی صدری ○ ویسّر لي أمری ○ وحلل عقدة من لّسانی یفقھوا قولی۔

یعنی پروردگار! میرا سینہ میرے لئے کھول دے اور میرے کام کو آسان بنا۔ چونکہ یہ بہت مشکل کام ہے لہٰذا اس عظیم منصب کو سنبھالنے کی ہمت مجھ کو عطا ہو۔

آج کے اس پر آشوب اور پرفتن دور میں استاد اگر کمرہ جماعت میں داخل ہوتے وقت یا پڑھائی شروع کرتے وقت مندرجہ بالا قرآنی دعا تلاوت کرلے تو بہترین نتائج برآمد ہونے امید کی جاسکتی ہے۔

اس کے علاوہ استاد کے لئے ایک اکسیری نسخہ یہ ہے کہ وہ کبھی یہ نہ سمجھے کہ میں نے تیس سال پڑھالیا ہے لہٰذا اب میرے پاس اتنا تجربہ ہے کہ میں کلاس کے لئے کسی تیاری کے بغیر بھی پڑھاسکتا ہوں۔

آج کے ان اس بدلتے حالات واطوار میں یہ بات کوئی زیادہ وزنی نہیں لگتی۔ کیونکہ علامہ اقبال کے الفاظ ''محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہوجائیگی'' کے مصداق ہر مضمون میں نت نئے اضافے اور تبدیلیاں رونما ہورہی ہیں۔ جو استاد مطالعہ بند یا کم کردیتا ہے وہ کامیاب استاد نہیں بن سکتا۔ جبکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ سبحانہ وتعالی نے یہ تعلیم دی ہے کہ:

قل رّب زّدنی علماً (اے نبیؐ) کہہ دیجئے کہ پروردگار! میرے علم میں اضافہ فرما(۵)۔

سرکار دوجہاں، معلم آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم علم میں اضافے کے لئے دعا مانگ رہے ہیں تو ایک مسلمان معلم اس سنت سے کیسے اعتنا برت سکتا ہے۔ اور علم میں اضافہ بغیر مطالعہ وتحقیق کے کسی استاد کے لئے کیسے ممکن ہے؟

سید ابوالاعلی مودودیؒ نے بجا فرمایا تھا کہ'' دنیا میں انبیاء کے علاوہ جتنے بھی بڑے لوگ ہیں سب مطالعے کے زور پر بنے ہیں'' مولانا مودودیؒ خود مطالعے کے کتنے شوقین تھے اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ قبر میں بھی مطالعے کی آرزو کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''میرے بس میں ہوتا تو میں قبر میں بھی تختوں کی بجائے کتابیں چنواتا''(٦)۔

ہر استاد اپنے طلباء کے لئے مثالی نمونہ (Role Model) ہوتا ہے۔ استاد کا کام نہ صرف پڑھانا ہوتا ہے بلکہ طلبہ استاد کو بھی پڑھتے ہیں۔ لہٰذا استاد کو چاہئے کہ اپنے چھوٹے چھوٹے اور عام معمولات کو

سنوار کر سلیقے کا مظاہرہ کرے کیونکہ بڑے یا اہم مواقع پر تو ہر آدمی سنبھل کر بات کرتا ہے۔ مثلاً استاد کا ظاہر صاف ستھرا ہونے کے ساتھ ساتھ اگر باطن بھی پاکیزہ ہو اور اس کا مظاہرہ وقت کی پابندی، اور خلوص دل کے ساتھ پڑھائی کی صورت میں ہو تو معجز نما اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ استاد پڑھاتے وقت طلبہ کے ذہنی سطح کا خیال رکھے اور اس نکتے کو یاد رکھیں "کلم النّاس علی قدر عقولھم"(۷) ''لوگوں کے ساتھ ان کے ذہنی سطح کے مطابق بات کریں'' اس کے علاوہ ٹھہر ٹھہر کر آرام سے پڑھایا جائے اور اہم نکات کو دہرایا جائے تو سنت نبوی کے ثمرات سے استاد اور شاگرد دونوں مستفید ہوسکتے ہیں۔ پڑھاتے وقت بلند آہنگ (High Sounding) الفاظ کے بجائے سلیس رواں اور طلبہ کے ذہنی معیار کے مطابق الفاظ کے انتخاب سے اچھے نتائج ہاتھ آسکتے ہیں۔

ہمارے طلبہ ہمارے پاس والدین اور قوم وملک کی امانت ہونے کے ساتھ ساتھ ہمارے اپنے بچوں کی مانند ہوتے ہیں۔ لہٰذا ان کو پڑھاتے وقت اور تنبیہ کرتے وقت ایک لحظے کے لئے بھی یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ یہ ہمارے اپنے بچے نہیں ہیں۔ ہمارے یہی بچے کل کے معاشرے کی تشکیل کرتے ہیں۔ گو استاد اور شاگرد کے درمیان تعلیم وتعلم، اخلاقیات وفرائض کے معاملات پل صراط پر چلنے کے مترادف ہے۔ لیکن نبوی فرمان کے مطابق "خیر الامور اوسطھا" بہترین کام میانہ روی کے ہیں'' نرمی اور مناسب سختی بہترین عمل ثابت ہوسکتا ہے۔

آج کے اس پیچیدہ دور میں استاد اپنے آپ کو شاگرد کے ساتھ کلاس تک محدود نہ رکھے بلکہ اگر ضرورت پڑے اور طالب علم استاد سے اپنے بعض ذاتی، خاندانی یا سماجی مسائل میں رہنمائی کے لئے درخواست کرے تو مناسب فاصلہ رکھ کر معاملات کو سلجھانے کی کوشش بھی ایک اچھے استاد کی نشانی ہے۔ طلبہ کی نفسیات اور عادات واطوار کو استاد خود پر مشابہ کر کے کبھی ڈیل نہ کرے۔ ان کی سائیکی کے پیش نظر کبھی کبھی بعض ہلکی پھلکی غلطیوں پر چشم پوشی کے مظاہرے سے بھی اچھے نتائج سامنے آسکتے ہیں۔

کبھی کبھی اگر طلبہ کو پڑھاتے پڑھاتے دورانیہ طویل ہو جائے تو اس میں مناسب وقفہ کیا جائے کیونکہ بعض اوقات صحیح اور اہم بات بھی اگر طوالت اور تسلسل کے ساتھ کی جائے تو اکتاہٹ کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا قول ہے "کان النبیؐ یتخولنا بالموعظة"(۹) یعنی نبی ﷺ ہمیں

وعظ ونصیحت کرتے وقت وقفہ فرماتے۔ پڑھنے پڑھانے کے سلسلے میں ایک اہم بات یہ ہے کہ بعض اوقات استاد طلبہ کو ایک بات بتا دیتا ہے لیکن بعد میں پتہ چلتا ہے کہ وہ بات یا معلومات وغیرہ بتانے میں غلطی ہوئی ہے تو کسی طالب علم کی طرف سے اصلاح، یا یاددہانی پر طالب علم کو شاباش دی جائے نہ کہ اسے خاموش کیا جائے۔ انسان بہت ضعیف ہے اور اس سے کسی وقت بھی غلطی ہو سکتی ہے لہٰذا ایسی بات کو استاد اپنے لئے کبھی عار نہ سمجھے۔ یا اگر بعد میں خود پتہ چلے کہ فلاں بات وغیرہ بتانے میں غلطی ہوئی تھی تو طلبہ کو بغیر کسی جھجک کے بتایا جائے کہ یہاں مجھ سے غلطی ہوئی تھی یہ بات یوں نہیں، یوں تھی۔ اس سے طلبہ کے اذہان پر استاد کی علمی دیانت کی عظمت راسخ ہو جاتی ہے۔

اگر کسی وقت کوئی طالب علم کسی بات کو نہ سمجھے یا سوال کرے تو ایسے طالب علم کی حوصلہ افزائی کی جائے تاکہ دوسرے طلبہ کو بھی سوال کرنے کی ہمت اور حوصلہ ہو جائے۔ اسی طرح کے سوال جواب سے استاد اور شاگردوں کے درمیان بہترین علمی تعلق پیدا ہوتا ہے۔

اگر کسی طالبعلم سے کوئی غلطی ہو جائے جس کا اکثر امکان ہوتا ہے تو اس کی خوبصورتی کے ساتھ تلافی کی کوشش کی جائے تاکہ اس غلطی کا اعادہ نہ ہو۔ اس سلسلے میں نبی ﷺ کے فرمان کو یاد رکھا جائے کہ "یسّروا ولا تعسرّوا"(۱۰) آسانی پیدا کرو تنگی پیدا نہ کرو۔

ایک دفعہ ایک بدو مسجد نبوی میں آیا۔ اس نے دو رکعتیں پڑھیں پھر دعا مانگی کہ اے اللہ مجھ پر اور محمدؐ پر رحم فرما۔ اور ہمارے ساتھ کسی اور پر نہ فرما۔ حضور ﷺ نے توجہ فرمائی کہ تو نے وسیع چیز کو تنگ کر دیا۔ اس بدو نے پھر جلدی میں مسجد میں پیشاب کیا۔ لوگ اس کی طرف مارنے کے لئے دوڑے تو آپ ﷺ نے فرمایا: "تمہیں آسانی کرنے والا بنایا گیا ہے مشکل پسند نہیں۔ اس پر پانی کا ایک ڈول بہا دو"(۱۱)

استاد کو چاہئے کہ وہ ملنساری، تواضع اور تحمل و برداشت کی صفات سے شاگردوں کو اس طرح قریب لائے جیسے شہد کی مکھیاں اپنے چھتے کے گرد بھنبھنا رہی ہوں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے شاگردوں کے لئے ایسے ہی تھے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے آپ کی اس صفت کا ذکر یوں فرمایا ہے۔

"ولو كنت فظّا غليظ القلب لا انفضّوا من حولك"(۱۲)

''(اے نبیؐ) اگر آپ سخت دل ہوتے تو یہ لوگ آپؐ کے اردگرد سے دور بکھر کر چلے جاتے''

آخر میں یہ ایک نکتہ بہت اہمیت کا حامل ہے کہ طلبہ کو یہ احساس کبھی نہ ہونے دیں کہ میں تو ایک ڈیوٹی جیسے تیسے نبھا رہا ہوں بلکہ ان کو بہت واضح انداز میں یہ پیغام ملنا چاہئے کہ نہ صرف پڑھانا ہی ایک مقدس فرض ہے بلکہ پڑھنا اور علم حاصل کرنا بھی اتنا ہی مقدس ہے۔ لہٰذا میرے اور آپ کے درمیان استاد اور شاگرد کا ایک مقدس رشتہ ہے۔ آپ میری قوم کے فرزند اور نونہال ہیں اور میں آپ کا روحانی باپ ہوں۔ لہٰذا آپ کو میں پیسے کمانے کے لئے نہیں پڑھاتا بلکہ اپنا مقدس فرض ادا کر رہا ہوں۔ ورنہ پھر اس بات کا خدشہ ہوگا جس کا ذکر علامہ اقبال نے کیا تھا۔

تھا وہ بھی وقت خدمت استاد کے عوض
دل چاہتا تھا ہدیہ دل پیش کیجئے
بدلا زمانہ ایسا کہ لڑکا پس از سبق
کہتا ہے ماسٹر سے کہ بل پیش کیجئے

خدا گواہ ہے کہ جب سے پیسہ تعلیم و تعلم میں شامل ہوا ہے وہ فضا ہی ختم ہوگئی ہے جس میں مطلوبہ تقدس قائم رہ سکتا ہو۔ معلّمی پیغمبرانہ پیشہ اسی لئے کہلاتا ہے کہ سارے انبیاء کرام کا مشن پڑھانا تھا لیکن اس کے بدلے انہوں نے لوگوں سے ہمیشہ یہ کہا کہ ''میرا اجر تو اللہ تعالیٰ کے ذمے ہے'' اس میں کوئی شک نہیں کہ روٹی کپڑا مکان انسان کی بنیادی ضروریات ہیں لیکن ان ضروریات کو مطمح زندگی بنانا کسی طرح درست نہیں۔ زندگی کے تمام معاملات کا معاشیات اور اقتصادیات کے گرد گھومنا یقیناً اسلامی فلسفۂ حیات سے روگردانی ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں نبی ﷺ کی نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

☆......☆......☆

حوالہ جات

۱۔ کنز العمال، حدیث رقم ۲۸۷۵۱، ۲۸۷۴۳، ۲۸۸۷۳

۲۔ سورۂ علق: آیت نمبر ۱

۳۔ سورۂ ال عمران: آیت نمبر ۱۶۴

۴۔ سورۂ طٰہٰ، آیات: ۲۵ تا ۲۸

۵۔ سورۂ طٰہٰ: آیت نمبر ۱۱۴

۶۔ شخصیات، سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، اسلامک پبلیکیشنز، ۱۹۷۳ء۔

۷۔ عربی ضرب المثل۔

۸۔ بیہقی ج ۳، حدیث رقم ۲۷۳

۹۔ صحیح بخاری، کتاب العلم، باب ما کان النبیّ ﷺ یتخوّلنا بالموعظة والعلم۔

۱۰۔ صحیح بخاری، کتاب العلم، باب ما کان النبیّ ﷺ یتخوّلنا بالموعظة والعلم۔

۱۱۔ بخاری، کتاب الوضوء، باب صب الماء علی البول فی المسجد۔

۱۲۔ سورۂ آل عمران: آیت نمبر ۱۵۹

☆......☆......☆

مسلم وغیر مسلم دنیا اور امریکہ

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ سوویت یونین کے زوال کے بعد امریکہ دنیا کی واحد سوپر پاور بن گیا۔ سائنس وٹیکنالوجی، رقبے، دنیا کے وسائل پر قبضے اور دنیا بھر کے ذہین افراد کے امریکہ کی طرف نکاس (Drainage) اور دنیا کے شاطر، دولتمند اور ذہین یہودیوں نے اس ملک کو اس وقت ظاہراً ناقابل تسخیر بنا دیا ہے۔ لیکن سوپر پاور کی حیثیت سے امریکہ کا دنیا کے ساتھ تعلقات کے حوالے سے جائزہ لیا جائے تو دنیا میں بہت کم لوگ ہونگے جو امریکہ کے حوالے سے خوشگوار تاثرات کا اظہار کریں گے۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد امریکہ کا دنیا کے سیاسی امور میں دخیل ہونے سے لے کر آج تک مجھے تو تاریخ میں کوئی ایسا واقعہ نظر نہیں آتا جس میں امریکہ نے عدل وانصاف کے تقاضوں کو مدّنظر رکھ کر دنیا کے معاملات کو برتا ہو۔ امریکہ کے بارے میں اس کی دھری پالیسیوں کے حوالے سے دنیا بھر میں شکایتوں کی بھرمار ہے۔ امریکہ دوغلے پن پر مبنی اپنے خارجہ پالیسیوں کو ''قومی مفادات'' کا نام دے کر مبنی برحق ثابت کرتا رہتا ہے۔

امریکہ کے خارجہ پالیسیوں کا ایک دوغلا پن یہ ہے کہ ان کے غیر مسلم دنیا کے ساتھ تعلقات اور نوعیت کے ہیں اور مسلم دنیا کے ساتھ الگ نوعیت کے۔ کہنے کو تو کوئی کہہ سکتا ہے کہ امریکہ کی سب سے بڑی لڑائی تو غیر مسلم دنیا کے ملک ویت نام اور شمالی کوریا کے ساتھ گزری ہے، یا روس کے ساتھ سرد جنگ اور اب چین کے ساتھ عجیب صورتحال میں الجھا ہوا ہے۔ یہ باتیں اپنی جگہ پر حقیقت ہیں لیکن یہ اور اس قسم کے سارے دیگر واقعات میں ایک اہم عنصر کبھی کارفرما نہیں رہا ہے۔ سابقہ سوویت یونین، چین، ویت نام، شمالی کوریا، مشرقی یورپ یا افریقہ میں امریکہ جہاں کہیں بھی معاملات میں ملوث رہا ہے وہاں صرف قومی اور مالی مفادات کا جھگڑا رہا ہے۔ جبکہ مسلم دنیا کے ساتھ قومی اور مالی مفادات کے علاوہ ایک اہم عنصر مسلمانوں کے دین ومذہب، تہذیب وثقافت اور تاریخی پس منظر کا بھی شامل رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم دنیا کے ساتھ امریکی رویہ مخالفت اور جنگ میں سخت ترین اور معمول اور دوستی نما تعلقات میں نفاق پر مبنی ہوتا ہے۔ گذشتہ ساٹھ سالوں میں بیشتر اسلامی ممالک امریکی چھتری کے نیچے رہ کر بھی بنیادی اور بہتر ٹیکنالوجی وانفراسٹرکچر وغیرہ کے حصول میں بری طرح ناکام رہے۔

امریکہ کی مسلم دنیا کے ساتھ دوستی کا حال یہ ہے کہ عالم اسلام کے چار بڑے اور اہم ممالک پاکستان، سعودی عرب، مصر اور ترکی گزشتہ نصف صدی سے امریکہ کے بہت قریبی حلیف رہے ہیں (مصر کے جمال عبد الناصر کے چند سال نکال کر) لیکن کسی ایک ملک میں بھی کوئی بڑا کوئی قومی مفاد کا پراجیکٹ امریکہ کی مدد سے منظر عام پر نہ آسکا۔

سعودی عرب دنیا کے امرین ترین ممالک میں شمار ہونے اور امریکہ کے ساتھ بہترین تعلقات رکھنے کے باوجود وہاں کوئی بھاری صنعتی انفراسٹرکچر تا حال مفقود ہے۔ حالانکہ امریکہ چاہے تو وہاں پٹرولیم مصنوعات کے علاوہ سائنس و ٹیکنالوجی کے حوالے سے اہم بنیادیں استوار کی جاسکتی ہیں لیکن آپ جائزہ لیجئے کہ خلیج کے ان امیر ممالک کی طرف امریکہ اور یورپ سے سامانِ تعیش کے علاوہ کون سی چیز برآمد ہوکر آرہی ہے جو مسلمانوں کے مستقبل کے لئے کوئی ٹھوس اور اہم بنیاد فراہم کرسکے۔ یہاں تو گزشتہ سالوں میں ایک بہت گہری منصوبہ بندی کے تحت خلیجی جنگوں کے نتیجے میں ایسی صورتحال پیدا ہوئی کہ ان دولت مند ممالک کے بجٹ متاثر ہونے لگ گئے۔

پاکستان پر امریکہ شروع دن سے مہربان ہونے کے باوجود یہاں کے عوام کے لئے کوئی ایسا کام نہ کرسکا جو امریکہ پاکستان دوستی کی زندہ پائندہ مثال بن سکے۔ سوویت یونین نے بھٹو صاحب کے دور میں پاکستان سٹیل مل اور چین نے ٹیکسلا اور کامرہ میں بہترین دفاعی سامان کی ٹیکنالوجی فراہم کرکے پاکستان پر جو احسان کیا ہے پاکستانی آج بھی اس کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اسی طرح کوہاٹ ٹنل پاک جاپان دوستی کی بہترین مثال ہے۔

پاکستان کو سیٹو اور سینٹو میں بزور شامل کرکے روس کو اس کا دشمن بنانا اور ایسے ہی واقعات کے نتیجے میں مشرقی پاکستان کے بنگلہ دیش بننے کے وقت روس کا پاکستان مخالف کردار اور امریکی وزیر خارجہ ہنری کسنجر کا یہ کہنا کہ ''ہم بنگلہ دیش بنانے کے حق میں تھے'' اس بات کا ثبوت ہے کہ امریکہ مسلم دنیا کے ساتھ کس قسم کے تعلقات کا خواہاں رہا ہے۔

ہم جب کبھی امریکہ کے اس قسم کے رویوں پر گلہ و شکایت کرتے ہیں کہ دیکھیں جی، ہم نے ساری عمر کوئلوں کی دلالی میں منہ کالا ہونے کے مصداق ہمیشہ آپ ہی کی خاطر اپنا چہرہ بگاڑا ہے تو امریکہ کی طرف سے ٹکا سا جواب ملتا ہے کہ ہم نے آپ کو اس کی ادائیگی ڈالروں میں کی ہے۔ اس جواب پر ہم جیسے عام لوگ حیران

و پریشان ہوکر امریکہ بہادر کی طرف ٹک ٹک دیدم، دم نہ کشیدم کے مصداق دیکھتے ہوئے سراپا سوال بن جاتے ہیں کہ آپ کے ان ڈالروں کا عام آدمی کی زندگی پر کونسا خوشگوار اثر پڑا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ اسلامی دنیا میں بالعموم اور پاکستان میں بالخصوص امریکہ کے حوالے گراف بہت نیچے گرا ہے۔

ہم پاکستانی جب یہ دیکھتے ہیں کہ امریکی گلستان کو تروتازہ رکھنے کے لئے جب بھی وقت پڑا تو خون ہم نے دیا لیکن جب بہار آئی تو کہتے ہیں کہ تیرا کام نہیں، تو بہت مایوسی، بددلی اور تھوڑے تھوڑے نفرت کے بھی شکار ہوجاتے ہیں۔ ہمارے پڑوسی ملک ہندوستان کے ساتھ آج کل امریکہ بہادر کے جو خوشگوار اور فطری محبت کے تعلقات ہیں اس کا ثبوت ہندوستان کو سول نیوکلیئر ٹیکنالوجی کے فراہمی کے علاوہ ہندوستان کے افراد اور مصنوعات کے لئے امریکہ کے چوپٹ کھلے ہوئے دروازے ہیں۔ جبکہ حال یہ ہے کہ ابھی کل ہی ہندوستان سابقہ سوویت یونین کا حلیف تھا اور پاکستان امریکہ کا حلیف ہونے کی بناء پر دونوں کے سبّ وشتم کا شکار تھا۔ گزشتہ دنوں ٹوکیو میں جی ایٹ ممالک کے دوران امریکہ بہادر کے صدر بش صاحب کی انڈیا کے وزیر اعظم منموہن سنگھ کے ساتھ جس خوشگوار موڈ میں اور ایک گونہ عاجزانہ قسم کی تصویر اخباروں کی زینت بنی ہے، اس قسم کے موڈ میں مسلم دنیا کے سربراہوں میں سے کسی کے ساتھ بش صاحب کے سارے دورِ صدارت میں شاید ہوئی کوئی تصویر کہیں چھپی ہو، زہے نصیب، لیکن کم از کم ہمیں بھی کہیں اپنی وفاداریوں کا کوئی تو صلہ ملے۔ صلہ نہ سہی، لیکن کم از کم اتنی وفاداریوں کے بدلے ہمارے ساتھ آج کل جاری سوتیلا سلوک تو ختم کرے اگر بالکلیہ ختم کرنا ممکن نہ ہو تو کچھ کم تو کرلے کہ ہمیں بھی سر اٹھانے، سانس لینے اور اترانے کا موقع نصیب ہو۔

لیکن میں جانتا ہوں کہ ایسا موقع کبھی نہیں آئے گا۔ کیونکہ ہم مسلمان ہیں۔ مسلمانوں کے ساتھ تعلقات رکھنے کے لئے لوگ اپنی تاریخ کو بھولنا نہیں چاہتے۔ دنیا کی تین بڑی اقوام اور مذاہب اس وقت یہودیت، عیسائیت اور ہندومت میں ہیں۔ تینوں کے ساتھ اسلامی دنیا کی ایک ایسی تاریخ رہی ہے جس میں مخالفت اور لڑائی کی ابتدا ان تینوں مذاہب کی طرف سے ہوئی، اہل اسلام نے ہمیشہ ان تینوں کے ساتھ سپین، فلسطین، قسطنطنیہ، اور ہندوستان میں رواداری اور رحم دلی کا سلوک کیا ہے لیکن ان کو جب بھی موقع ملا ہے، مسلمانوں کو دبانے اور نیست ونابود کرنے کا کوئی موقع ضائع نہیں کیا ہے۔

سپین میں شاہ فرڈی ننیڈ اور ملکہ آزابیلا اور اس کی عیسائی فوجیوں نے جو کچھ اندلس کی اسلامی سلطنت کے

زوال کے بعد کیا، سپین پر آٹھ سو سال حکومت کرنے کے دوران کوئی اس قسم کا ایک واقعہ ایسا پیش نہیں کیا جا سکتا جس میں مسلمانوں نے کہیں سپین کے باشندوں کے ساتھ کیا ہو۔ ہندوستان پر ہزار سال حکومت کے دوران مسلمان اگر اپنی دینی تعلیمات کے تحت رواداری کا سلوک نہ کرتے تو آج کسی صورت بھی ہندوستان میں ہندوؤں کی اکثریت نہ ہوتی۔ یہی حال یہودیوں کا ہے کہ جب یورپ میں نازی ازم نے ان پر خدا کی زمین تنگ کردی تو ان خانہ بربادوں کو کہیں جائے امان وپناہ ملی تو مسلمانوں کے ہاں ملی۔ لیکن آج یہود ونصاریٰ امریکہ بہادر کی چھتری کے نیچے یک جان دو قالب کا مظاہرہ کرتے ہوئے سارے مسلمانوں کے درپے آزار ہیں۔

صیہونی یہودی فلسطین میں فلسطینی مسلمانوں کو نیست ونابود کرنے پر تلے ہوئے ہیں، ہندو مقبوضہ کشمیر میں اپنی سات لاکھ ظالم اور غاصب فوج کے ساتھ کشمیریوں پر تاریخ کے بدترین مظالم ڈھا رہے ہیں اور عیسائی افواج نیٹو کے جھنڈے تلے عراق اور افغانستان میں بے گناہ ومعصوم بچوں، خواتین اور بزرگوں اور ضعیفوں کو بدترین زندگی سے دوچار کیے ہوئے ہیں۔

سات سمندر پار سے ہزاروں میل کا فاصلہ طے کر کے مسلمان ممالک ووسائل پر قبضہ کر کے پاکستان کو دھمکیاں بھی مل رہی ہیں کہ آپ کی سرزمین سے ہم پر حملے ہو رہے ہیں۔ ان کو بند کردو ورنہ ہم ان دہشت گردوں کے تعاقب میں پاکستانی حدود کو عبور کرنے سے گریز نہیں کریں گے۔

ہمارے ہاں کوئی ایسا مردِ رشید نہیں ہے جو ان سے کہہ سکے کہ حضور! آپ اتنے دور سے افغانستان جیسے پسماندہ، گنوار، تہذیب کی چکا چوند سے نابلد ملک میں اپنے بہترین اربوں ڈالر کے وسائل اور سپاہ کیوں پھونک وجھونک رہے ہیں۔

ان ''وحشی'' افغانوں کو اپنے حال پر چھوڑ دیں۔ آپ اپنے ترقی یافتہ ملکوں میں اپنی تعیش پرستانہ زندگی انجوائے کریں۔ آپ یہاں سے رخصت ہو جائیں اگر یہ لوگ وہاں آ کر آپ پر کوئی حملہ وغیرہ کرلیں تو ان کو وحشت ناک سزائیں دے دو۔ لیکن جب تک آپ ان کے ملک پر قابض ہیں یہ ''گنوار'' افغانی وغیرہ یونہی لڑتے رہیں گے کہ ان کی فطرت یہی ہے کہ جو کوئی ان کے ملک پر قابض ہوا ہے یہ ان کے ساتھ سر ٹکراتے رہے ہیں یہاں تک کہ یا تو وہ ریزہ ریزہ ہو گئے ہیں یا حملہ آور دم دبا کر بھاگ گیا ہے۔ اکثر حملہ آور ہی بھاگا ہے۔ جہاں تک ان کے داخلی معاملات کا تعلق ہے تو یہ ان کی فطرت ہے کہ کرسیٔ اقتدار پر طاقتور ہی

بیٹھا رہا ہے لہٰذا طاقتور کا فیصلہ کرنے کے لئے ان کو آزاد چھوڑنا ہوگا ورنہ اگر کوئی باہر سے کسی کو نام نہاد طور پر طاقتور بنا کر ان پر مسلط کرنے کی کوشش کرتا ہے تو ناکامی کے سوا انہیں کچھ نہیں ملتا۔

اگر امریکہ اور یورپی ممالک کا یہ خیال ہے کہ ہم مسلمان ممالک کو سودی قرضے دے کر اور ان کو W.W.W کی جالوں میں پھنسا کر اپنا کام نکالتے رہیں گے تو ایک عارضی منصوبے کے طور پر تو یہ شاید کامیاب ہو جائیں لیکن مسلم ممالک کے ساتھ پائیدار، خوشگوار اور انسانی بنیادوں بر مضبوط تعلقات کے قیام کے لئے یہ قطعاً مناسب نہیں۔

اگر دنیا واقعی گلوبل ویلیج بنی ہے اور دنیا اکیسویں صدی میں داخل ہو چکی ہے تو معاملات بھی اس کے مطابق چلانے ہوں گے۔ مسلمانوں کو ایک وقت تک مجبور رکھا جا سکتا ہے لیکن جب تک دنیا قائم ہے، قرآن وحدیث کی تعلیمات موجود رہیں گی اور ان کی موجودگی میں مسلمان کبھی بھی غلامی برداشت نہیں کریں گے۔ لہٰذا ضررت اس بات کی ہے ک دنیا میں امن، محبت اور انسانیت کی بنیادوں پر تعلقات کی استواری کے لئے اور دنیا کو آرمیگڈان سے بچانے اور محفوظ رکھنے کے لئے باہمی افہام و تفہیم، اشتراک عمل و وسائل کو آگے بڑھانا اور استعماری سوچ و فکر کو ختم کرنا ہوگا، ورنہ یہ کشمکش جاری وساری رہے گی اور انسانیت بے چین، بے آرام اور بے سکون رہے گی۔ یاد رکھو! اللہ کے ذکر ہی سے دلوں کو اطمینان ملتا ہے!

☆......☆......☆